حمیرا نگاہ

خوشی کے لمحے مختصر ہوتے ہیں جبکہ دُکھ اور تکلیف کا دورانیہ کم ہو تب بھی بہت لگتا ہے اور انکے گزر جانے کے بعد انہیں بھلا دینا آسان نہیں ہوتا۔ اسکے ساتھ بھی تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا مگر اسکے لئے بھلانا آسان نہیں، ناممکن تھا۔

موسم بدل چکا تھا۔ سردی دھیرے دھیرے رُخصت ہو رہی تھی۔ پیڑوں پر کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، ساری وادیاں پھر سے سر سبز ہو گئی تھیں۔ پہاڑوں نے سبز مخمل کا لباس پہن لیا تھا۔ میٹھی میٹھی خوابناک جزیروں کی سطح پر بچھی ہوئی سر سبز گھاس، روح میں اُتر جانیوالی خوشبو کیساتھ پھولوں کی پیشانی پر بوسہ دے رہی تھی۔ سفید برف اسطرح پھگل رہی تھی جیسے آنسو بہتے ہوں۔ پھولوں کی جوانی کا موسم پورے عروج پر تھا۔ باداموں کے جھنڈ سے گزرنے والی ہوا تالیاں بجا کر جوش و خروش سے بہار کا استقبال کرنے میں ہمہ تن گوش تھی۔ انگور کی بیلیں، شہتوت کی ڈال اور لہلہاتی کھیتیاں، قدرت کی رعنائیاں سب کچھ تو تھا اسکے پاس لیکن لیکن اندر دل کی گہرائیوں میں جمی برف کی وجہ سے موسم سرد تھا۔ روح کی تنہائیوں میں کہیں بہت گہرا درد تھا جو اسے ان بدلتے موسموں سے، گنگناتے آبشاروں سے لُطف اندوز نہ ہونے دیتا، وہ کتنی دفعہ ٹوٹ کے بکھری تھی، بس وہی جانتی تھی، اسکے زخموں پر کسی نے مرہم نہ رکھا۔ بظاہر اسکا زخم بھر گیا لیکن اندر سے آج بھی زخم ہرا تھا۔

وہ چپ چاپ باداموں کے باغ میں بیٹھی، ٹھنڈی میٹھی ہوا کو اپنے اندر اُتار رہی تھی تا کہ وہ آگ بجھ سکے جو کئی سال قبل اسکے من میں لگی تھی لیکن وہ آگ بجھنے کی بجائے مزید بھڑکتی جا رہی تھی۔ "واہ خدایا کیا نظامِ ہستی ہے تیرا کہ کچھ لوگ تو راہوں میں کانٹے بو کر منزل پا لیتے ہیں، نیک نامی حاصل کر لیتے ہیں اور کچھ راستے میں پھول اُگانے کے بعد بھی بدنامی کا داغ چہرے پر سجا لیتے ہیں۔ کوئی دو قدم چلے تو منزل مقدر ٹھہرتی ہے اور کوئی کسی کے قدموں کی خاک بن کر بھی منزل تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا"۔ اس سے پہلے کہ اسکی سوچیں اسے ماضی میں دھکیلتیں، ننھی مریم کی آواز اسے حال میں واپس کھینچ لائی۔

"ماما! جلدی گھر چلیں آپکو نانو بلا رہے ہیں"۔ وہ اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔

"ہوں۔۔۔۔ اچھا۔۔۔ چلو"، وہ گڑبڑائی جلدی سے ڈوپٹے کے پلو سے برستی آنکھوں کو صاف کیا اور ڈوپٹہ اچھی طرح اوڑھنے کے بعد مریم کیساتھ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی حویلی کی جانب چل دی۔

"ماما! آپ رو رہی تھیں نا۔۔۔ آپکو بابا یاد آ رہے تھے نا؟"۔ مریم منہ بسور کر رہیں کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا بیٹا! چلو نا۔ نانو کھانے پر اِنتظار کر رہے ہوں گے"۔ وہ اسے بہلانے لگی لیکن مریم ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"پہلے بتائیں آپ کیوں رو رہی تھیں؟"۔ وہ اِتنی چھوٹی سی عُمر میں ہی بہت حساس تھی۔ کسی کا ایک آنسو اسے بہت پریشان کر دیتا تھا۔ وہ کسی کو رنجیدہ اور تکلیف میں نہ دیکھ سکتی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا۔۔۔"۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ ماضی کی پرچھائیاں اب تک اسکے حال سے لپٹی ہیں یا پھر یہ کہ اس کے ناکردہ گناہوں کی بہت بڑی سزا مل رہی ہے۔ وہ خاموش رہی۔ مریم نے ایک دو منٹ اِنتظار کیا لیکن جب گل زریں کچھ نہ بولی تو مریم نے اسکا ہاتھ چھوڑ دیا اور بھاگتی ہوئی حویلی میں داخل ہو گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لیکر ہوا کو اپنے اندر اُتارا اور حویلی کی جانب بڑھی لیکن ہال کمرے میں داخل ہونے سے قبل اندر سے آتی آوازوں نے اُسے وہیں روک دیا جہاں وہ کھڑی تھی۔

"آغاجی، ہم نے آج تک گل زریں کا برا نہیں چاہا۔ آپ ایک دفعہ اس سے بات کر کے تو دیکھیں، شاید وہ مان جائے"۔ داور خان کی آواز وہ بخوبی پہنچانتی تھی۔

"بیٹا! میں جانتا ہوں وہ کبھی نہیں مانے گی، نہ آج نہ کل، میں ڈرتا ہوں کہ میری کسی بات سے اسکو تکلیف نہ پہنچے اور پھر مریم بھی تو ہے"۔ ہمایوں خان آفریدی کی آواز گونجی۔

"آغاجی! مریم پہلے بھی ہم سب سے بہت اٹیچڈ ہے، وہ بہت سمجھدار بچی ہے"۔ پتہ نہیں وہ کیا باور کرانا چاہ رہا تھا۔ گل زریں نے کچھ لمحے توقف کیا پھر ہال کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

"آؤ آؤ گل زریں! کیسی ہوں؟"۔ اسے دیکھ کر داور خان آفریدی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ٹھیک ہوں لالہ۔ آپ کیسے ہیں؟ پوردل اور شیر خان کا کیا حال ہے؟" وہ چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی تو وہ بھی بشاشت سے مُسکرا دیا۔

"بالکل ٹھیک"۔

"شہر سے کب آئے؟ مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں؟"۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"رات آیا تھا، ابھی جارہا ہوں نوکری کا مسئلہ ہے ورنہ ضرور رُکتا"۔ وہ اسکے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے بولا۔

"خوامخواہ تم نے سرکاری نوکری کا دردِ سر مول لیا ہوا ہے۔ زمین اور باغات سنبھالو اپنے، اب میری بوڑھی ہڈیوں میں اِتنا دم خم کہاں کہ ہر طرف توجہ دے سکوں"۔ آغا جی کی بات سُن کر وہ مسکرایا۔

"کچھ کرتے ہیں آغا جی"۔ وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا بیٹھو، کھانا تو کھالو"۔ ہمایوں آفریدی اسے دیکھ کر بولے۔

"نہیں آغا جی! میں اب چلوں گا۔ اماں بھی گل زریں کیلئے بہت پریشان ہیں۔ آپ جلد ہی کوئی فیصلہ کرلیں"۔ وہ رُکا نہیں چلا گیا اور گل زریں حیران و پریشان کبھی جاتے ہوئے داور خان کی طرف دیکھتی اور کبھی اپنی نظریں سامنے بیٹھے باپ جیسے چچا پر ڈالتی۔

"کیا بات ہے آغا جی! داور لالہ کیوں آئے تھے یہاں"؟ وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی۔ "کیا فیصلہ کرنا ہے آپکو پلیز آغا جی بتائیں نہ"۔

"بیٹا! داور کا خیال ہے کہ اب تمہاری شادی کر دینی چاہیے۔ تمھاری اماں بی بہت پریشان ہیں تمہارے لئے"۔ وہ دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

"آغا جی! کیا آپ نہیں جانتے کہ نکاح پر نکاح نہیں کیا جاتا۔ آغا جی میں ایک عورت ہوں۔ کسی کی منکوحہ اور ایک بیٹی کی ماں۔۔۔۔۔۔۔" اسکی آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ کر وہ بوکھلا اُٹھے لیکن اس سے قبل کہ وہ بولتے وہ پھر گویا ہوئی۔

"آغا جی! کیا میں اور میری بیٹی آپ پر بوجھ بن گئی ہیں؟ کیا اِس حویلی میں جگہ تنگ ہو گئی ہے یا آپ لوگوں کے دِل تنگ پڑ گئے ہیں۔ میں یہ حویلی چھوڑ کے چلی جاتی ہوں آغا جی کیونہ مجھے یہ حویلی چھوڑنا تو منظور ہے لیکن دُوسرا فیصلہ کرنا قطعاً قبول نہیں۔ آخر میری بیٹی کا کیا قصور ہے۔ اسے کس بات کی سزا دی جارہی ہے؟ جب میں نے مرنا چاہا تو آپ نے مجھے مرنے نہیں دیا اور آج جب مریم کو دیکھ کر مجھ میں جینے کی اُمنگ پیدا ہوئی ہے تو آپ مجھے ماردینا چاہتے ہیں۔ آغا جی کیوں کر رہے ہیں آپ ایسا؟" اس نے اسقدر واضح بات کی تھی کہ وہ گنگ ہو کر رہ گئے۔

ماحول پر ایک بار پھر سکوت چھا گیا، جیسے وہاں کوئی ذی روح موجود نہ ہو۔ اس سکوت کو داور خان کی آواز نے توڑا جو گاڑی کی چابی وہیں ڈائننگ ٹیبل پر بھول گیا تھا۔

"کسکی بیٹی؟ بولو گل زریں کس کی بیٹی کو سزدی جا رہی ہے؟ ہمیں تو آج تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ مریم کا باپ کون ہے؟ تم تو جانتی ہو نا، بولو بتاؤ کون ہے اسکا باپ؟"، وہ غصے سے بھرپور انداز میں چلا رہا تھا۔ وہ ایک لحظہ کو ڈگمگائیلیکن پھر فوراً سنبھل کر بولی۔

"ہمیش خان آفریدی کی بیٹی ہے مریم۔ سُنا آپ نے داور لالہ! مریم کا باپ ہمیش خان ہے"۔

"کس کو تسلی دے رہی ہو گل زریں! خود کو، ہمیں یا پھر۔۔۔ خدا جانے گل زریں تم کب سمجھ پاؤ گی ہماری بات۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ولدیت کے خانے میں ہمیش خان کا نام آنے سے وہ اسکی بیٹی بن گئی ہے۔ تو سراسر غلط سوچتی ہو تم کیونکہ اگر ہمیش خان کو اِتنا ہی اسکا وجود پسند ہوتا تو اس بات کو ایشو بنا کر وہ گھر نہ چھوڑتا"۔ وہ اِسے حقیقت بھرا آئینہ دِکھا رہا تھا۔

"داور لالہ! پلیز آپ گڑھے مُردے مت اکھاڑیں"۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"میں جانتا ہوں گل زریں! کہ گڑھے مُردے اُکھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیش خان کو گئے آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ اِن آٹھ سالوں میں اس نے مڑ کر خبر نہیں لی۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا اسے میں نے؟ کب تک تم اسکے نام پر بیٹھی رہو گی؟ سہیل خان ایک اچھا آدمی ہے اور سب سے بڑھ کر میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اس نے خود تمہیں پرپوز کیا ہے اور ہم نے۔۔۔۔۔۔"

"بس داور لالہ، اس سے زیادہ ایک لفظ نہیں، وہ بے شک اچھا سہی، بہت اچھا سہی لیکن میری ماضی کی یادیں اذیت ناک ہیں داور لالہ اور مستقبل کے تفکرات میرے لئے عذاب ہیں۔ کیا ہوا تھا اور کیا ہو گا میں اِن سوچوں میں چاروں طرف سے گھر چکی ہوں۔ میں تھک گئی ہوں لڑتے لڑتے"۔ وہ ہانپنے لگی تو داور خان نے آگے بڑھ کر اسے پانی کا گلاس پکڑایا۔

"ریلیکس گل زریں! تم پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا"۔ اسکی یہ حالت دیکھ کر اسکا دِل کٹ کٹ جاتا تھا لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ اگر کرنے کا سوچتا تو گل زریں کی انا اور ہمیش خان سے محبت آڑے آجاتی۔ وہ بہت بے بس اور مجبور ہو گیا تھا۔ اس نے اسکا سر آہستہ سے تھپتھپایا اور ٹیبل سے کی رِنگ اُٹھا کر باہر چل دیا۔

"گل بیٹا! کھانا کھالو۔ جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہو گا کیونکہ جو تم جانتی ہو وہ کوئی اور نہیں جانتا اور اگر کوئی جان لے تو۔۔۔ خیر چھوڑو"۔ آغا جی اسے بہلانے کی کوشش کرنے لگے۔

"نہیں آغا جی! بھوک نہیں ہے"۔ وہ کُرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی اور سبک رفتار سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ جب کہ ہمایوں خان آفریدی جانتے تھے کہ وہ ضبط کے کن کڑے مراحل سے گُزر رہی ہے۔

ہمایوں خان آفریدی کے دو بھائی تھے۔ ان سے چھوٹے خوشنود آفریدی اور سب سے چھوٹے عُمر آفریدی۔ محبت کے احساس کی رنگینیوں کے ساتھ وہ تینوں بھائی اپنے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ تینوں کی یکے بعد دیگرے شادیاں کر دی گئیں۔ ہمایوں آفریدی کی بیٹی پوردِل، خوشنود آفریدی کے دو بیٹے داور خان اور ہمیش خان اور عُمر خان کی بیٹی گل زریں انکے مہکتے باغ کے تازہ کھلتے پھول تھے۔ خاندانی دُشمنی نے چھوٹی سی عمر میں ہی گل زریں سے اُس کے باپ کو چھین لیا۔ سارے گھر والوں کی محبتوں کے احساس اور نرم رویوں نے اسے خود سر اور ضدی بنا دیا تھا جبکہ پوردِل اپنے باپ کی طرح ہی نرم دِل تھی۔ یوں ایک حویلی میں رہتے ہوئے وہ سب ایک دوسرے کو دِل کی دھڑکنوں میں بسائے رکھتے تھے۔ جب بچے شعور کی منزل کو پہنچے تو داور خان اور پوردِل کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ گل زریں اور ہمیش خان کے مزاجوں میں موافقت نہ ہونے کی وجہ سے فیصلہ مستقبل پر چھوڑ دیا گیا۔ خوشنود خان اور پوردِل کی والدہ زینت خاتون شہر گئے تو واپس خون میں نہا کر آئے۔ ایک روڈ ایکسیڈینٹ میں دونوں جان سے گئے۔ جوں جوں روز و شب کھسکتے جا رہے تھے، گل زریں کی ضد اور خود سری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہمیش خان نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو گل زریں نے بھی ضد شروع کر دی کہ وہ بھی یونیورسٹی میں داخلہ لے گی۔ سب کے سمجھانے کے باوجود اسکی ضد ختم نہ ہوئی تو ہمیش خان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ سمجھنے والی نہ تھی۔

"یہ کیا ڈرامہ ہے؟" وہ غصّے سے دھاڑا۔

"کیسا ڈرامہ؟ اگر یونیورسٹی میں پڑھنا ڈرامہ ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ اِس ڈرامے میں شامل ہونا چاہتی ہوں"۔ وہ اسکے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"شٹ اپ، فضول بولنا بہت آگیا ہے تمہیں۔ تم جانتی ہو کہ ہمارے خاندان میں لڑکیاں صرف میٹرک تک پڑھتی ہیں اسکے باوجود تم نے بی اے کیا۔ پوردِل کو دیکھو آرام سے گھر بیٹھی ہے۔ مگر پتہ نہیں تمہارے دماغ میں کیا خناس سمایا ہے"۔ اسکی آواز غصے کی شدت سے پورے کمرے میں گونجی تھی۔

"پوردِل اور مجھ میں بہت فرق ہے ہمیش خان! برائے مہربانی مجھے اس سے مت ملاؤ"۔ وہ تنک کر بولی تو اسکا دماغ گھوم گیا۔

"کیا فرق ہے تم دونوں میں، بولو جواب دو؟"

"میں سورج کی کرنوں کے ذریعے آسمان تک نہیں پہنچنا چاہتی، شبنم کی طرح پھولوں کے کندھوں کا بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ تم جانتے ہو خان مانگنا میری عادت نہیں ہے، میں صرف فیصلہ سنایا کرتی ہوں"۔ وہ دوبدو بولی تو وہ مزید چٹخا۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ فیصلہ کون سناتا ہے اور مانگتا کون ہے گل زریں صاحبہ"، وہ لفظوں کو چبا چبا کر بولا۔

"اِس حویلی کے مرد جب تمام عیاشیاں افورڈ کر سکتے ہیں، اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ خود پڑھ سکتے ہیں تو پھر حویلی کی عورتوں پر پابندی کیوں؟"۔ اس نے براہِ راست اسکی خودداری پر حملہ کیا تو ہمیش خان نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔

"حد ہوتی ہے گل زریں! بولنے سے پہلے سوچ لیا کرو"۔ وہ نرم لہجے میں بولا۔

"ہمیش خان! میں سوچ کر بولتی ہوں۔ سب جانتے ہیں کہ میں جو چاہتی ہوں وہ کرتی ہوں۔ اسلیئے میں ضرور ماسٹرز کروں گی"۔ وہ اسکے نرم لہجے کو دیکھ کر خود پر قابو پاتی بولی۔

"تو کرو ماسٹرز کون منع کر رہا ہے؟ مجھے مضامین بتانا میں کتابیں فراہم کردوں گا تمہیں"۔ وہ طنزیہ انداز میں بولا تو اسکے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"میں اپنی مرضی سے پڑھوں گی ہمیش خان! اور اسی یونیورسٹی میں داخلہ لوں گی جس میں تم لے رہے ہو"۔ وہ فاتحانہ انداز میں اسکی طرف دیکھتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی جبکہ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"سب کے سمجھانے کے باوجود اسکی ایک ہی ضد تھی کہ وہ داخلہ ضرور لے گی جب اس نے اپنی ضد نہ چھوڑی تو آغا جی نے ایک اور فیصلہ کیا۔

"ٹھیک ہے تم یونیورسٹی میں داخلہ لے لو لیکن اس سے پہلے تمہارا اور ہمیش خان کا نکاح ہو گا"۔

وہ انکی بات سُن کر گنگ رہ گئی لیکن کچھ نہ بولی جانتی تھی ہمیش ضرور بولے گا۔

"مگر آغا جی! یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ بہت ضدی ہے اور اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔"۔وہ ہمایوں خان کی بات سن کر ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔اس نے تو اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا اور وہ تو اس کے مدِمقابل کھڑا ہونا چاہتی تھی اور خاندان کی ریت و رواج میں ایسا کب ممکن ہوا تھا۔

"مگر یہ ضروری ہے ہمیش خان! کیونکہ اس نے اگر یونیورسٹی میں کوئی اور حماقت کر ڈالی تو ہم کہیں نظر اُٹھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ وہ عمر کی بیٹی ہے اور مجھے جان سے بڑھ کر عزیز ہے"۔ آغا جی اسے روبرو طلب کر کے اپنی خواہش کا اِظہار کر رہے تھے جبکہ وہ کچھ بھی ماننے پر تیار نہ تھا۔

"سارے گھر کی لاڈلی ہے اسلئے ضدی ہے۔وقت کیساتھ ساتھ سمجھدار ہو جائے گی"۔وہ اسے سمجھا رہے تھے۔اسکی زندگی کا ہر فیصلہ آغا جان نے ہی تو کیا تھا۔اسے ان سے خاص اُنسیت تھی اسکے لئے انکا ہر لفظ حرفِ آخر ہوتا تھا۔بہت بحث ہوئی لیکن بالآخر ہمیش خان نے ہتھیار ڈال دیئے۔

اِس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔دونوں کے ڈیپارٹمنٹ مختلف تھے۔اسلئے آمنا سامنا بہت کم ہوتا لیکن اس دِن تو حد ہی ہو گئی۔وہ اپنی دوست شائستہ شنواری کیساتھ اپنے ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکل رہی تھی تو سامنے ہی ہمیش خان خراماں خراماں چلا آرہا تھا۔وہ اسے دیکھ کر رُکی لیکن وہ اسے دیکھ کر چپ چاپ آگے نکل گیا۔

"یہ ہمیش خان ہے،یونیورسٹی کا لائق ترین سٹوڈنٹ،بی ایس آنرز بھی اِسی یونیورسٹی سے کیا ہے۔لڑکوں اور لڑکیوں میں یکساں مقبول"۔شائستہ اسے حقیقت سے آگہی دے رہی تھی یہ جانے بغیر کہ اس سے بڑھ کر کون جانتا ہو گا ہمیش خان کو۔

"اچھا۔۔۔۔اور کوئی اِنفارمیشن؟"۔وہ مسکرائی۔

"ایک بہن بھی پڑھتی ہے اسکی یہاں،مریم خان اسی کے ڈیپارٹمنٹ مں ہے۔تم سمجھو چولی دامن کا ساتھ ہے بہن بھائی کا"۔وہ چونکی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اسی سال آئی ہے سائے کی طرح دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کیساتھ چپکے رہتے ہیں۔ نہ تو مریم خان کی کسی سے دوستی ہے اور ہمیش خان نے تو اپنے دوستوں تک کو چھوڑ دیا بہن کی وجہ سے"۔ اسے ایک لمحے کو تو اپنے کانوں پر شک گزرا لیکن پھر وہ خاموشی سی سنتی رہی۔ اسکے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹ گیا کیونکہ وہ بخوبی جانتی تھی کہ ہمیش خان کی کوئی بہن نہیں ہے۔

"چلیں"، شائستہ بولی

"اوں۔۔۔۔ہاں"، وہ چونکی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، سر میں معمولی درد ہے۔ میں ہاسٹل جا رہی ہوں تم باقی کی کلاسیں لیکر واپس آجانا"۔ وہ چپ چاپ وہاں سے نکل آئی۔ ہاسٹل جانے کی بجائے وہ سیدھی انگلش ڈیپارٹمنٹ سے ہوتی ہوئی زوالوجی ڈیپارٹمنٹ کی طرف چلی آئی۔ سامنے ہی ہمیش خان کسی لڑکی کیساتھ کھڑا تھا۔ وہ گل زریں کو سامنے دیکھ کر لمحے بھر کو ہڑبڑایا لیکن فوراً ہی سنبھل کر آگے بڑھا۔

"آؤ آؤ گل زریں! کیسے آئی ہو؟"، گل زریں نے دیکھا کہ اس لڑکی کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔

"میں ذرا ہمیش خان کی مصروفیت دیکھنے آئی تھی"۔ وہ پاس کھڑی لڑکی کو دیکھ کر استہزائیہ انداز میں بولی تو وہ بوکھلا اٹھا۔

"یہ مریم خان ہے گل زریں"، وہ تعارف کروانے لگا۔

"غائبانہ تعارف تو تھا آپ سے لیکن آج آپکو دیکھ بھی لیا۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی"۔ مریم خان نے ہاتھ آگے بڑھایا تو گل زریں نے نخوت سے جھٹک دیا۔

"لیکن مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔۔۔۔۔۔اور تمہیں تو ہمیش خان میں حویلی جا کر پوچھوں گی"۔ وہ غصے سے بولی۔

"گل زریں! کوئی بھی بات کرنے سے قبل یاد رکھنا کہ ہوا اپنے ساتھ مٹی بھی اڑا کے لاتی ہے لیکن گھر تعمیر نہیں کر سکتی"۔ وہ اسے تنبیہ کر رہا تھا لیکن وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔

"مشورے کا شکریہ"، وہ پاؤں پٹختی ہوئی چل پڑی۔

"اب کیا ہو گا ہمیش خان؟"، مریم فکر مندی سے بولی۔

"کچھ نہیں ہو گا اچھا ہے گل زریں بات شروع کرے گی تو ہمارا مسئلہ اور آسان ہو جائے گا۔ ویسے بھی آج نہیں تو کل مجھے آغا جی سے بات کرنی تھی نا؟" وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا وہ تو مسکرانے لگی۔

ہمیش خان جب حویلی لوٹا تو اسکا خیال تھا کہ اچھا خاصا فساد برپا ہو چکا ہو گا لیکن وہاں بالکل خاموشی تھی۔ وہ بہت حیران تھا کہ زریں گل اور چپ رہ جائے۔ وہ اس انتظار میں رہا کہ کب گل زریں آغا جی سے بات کرتی ہے تا کہ وہ کھل کر آنیوالے دِنوں کا لائحہ عمل تیار کر سکے لیکن جب ہفتہ گزرنے کے باجود کوئی بات نہ ہوئی تو وہ بھی واپس ہاسٹل جانے کی تیاری میں لگ گیا۔ وہ جانے لگا تو داور نے اسے روکا۔

"ہمیش خان! آج رُک جاؤ کل چلے جانا"۔

"کیوں لالہ؟ خیریت تو ہے؟"۔ اسکا ماتھا ٹھنکا۔

"ہاں بالکل خیریت ہے۔ گل زریں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ تم کل اسے بھی ساتھ لیتے جانا"۔

"میں کل چلا جاتا لیکن میرا آج جانا بہت ضروری ہے کوئی انوسٹیگیشن ٹیم آ رہی ہے اوپر سے"۔ اسکا دِل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن داور لالہ کے سامنے اِنکار کی جارت بھی نہ تھی۔

"جی لالہ"۔ وہ دروازے کی جانب چل دیا۔

"نہیں بھائی جی! آپ بس چپ رہیں سمجھ کیا رکھا ہے اس نے اپنے آپکو"۔ اماں بی مسلسل بول رہی تھیں۔

"نہیں بہن جی! وہ بس ذرا جلدی میں تھا میں خود بات کروں گا اس سے"۔ آغا جی سر جھکائے بول رہے تھے۔

"کیا ہوا اماں خیر تو ہے؟"۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"ارے سارے کہتے تھے وہ بچی ضدی ہے لیکن تو نے تو اسے بھی پیچھے دھکیل دیا۔ کچھ خدا کا خوف نہیں ہے"۔ وہ اس پر چڑھ دوڑیں۔

"ارے اماں! بات بتائیں گی تو پتہ چلے گا نا"۔ اسکا لہجہ سہما سہما تھا۔

"دیکھ ہمیش خان! میں بول رہی ہوں تو نے اگر گل زریں سے ایسا ناروا سلوک رکھا تو مجھے کچھ اور سوچنا پڑے گا"۔ وہ تڑک کر بولیں تو وہ حواس باختہ ہو گیا۔

"اماں ایسا کیا کیا ہے میں نے؟"۔ وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"آج ہفتہ ہو گیا ہے اسے بخار ہوئے، تجھ سے اِتنا نہ ہو سکا کہ اس بچی کا حال ہی پوچھ لے۔ ارے بیوی ہے وہ تیری۔ بیوی سمجھ کہ نہیں تو چچازاد سمجھ کر ہی پوچھ لیا ہوتا"۔

وہ اسے لتاڑ رہی تھیں اور اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ پتہ نہیں گل زریں کیساتھ ایسا کیا کر دیا اس نے کہ اماں اِتنے غصے میں آگئی ہیں۔ وہ چپ چاپ اسکے کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے میں پاؤں رکھا اور ٹھٹھک کر رُک گیا۔ اسکا پھول کی طرح شاداب چہرہ اک ہفتے میں کملا کہ رہ گیا تھا۔ خوبصورت کالی آنکھوں میں اُداسی کے رنگ تھے۔ اس نے ہمیش خان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو بیڈ کراؤن کساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"آؤ ہمیش خان! آج تم میرے کمرے کی راہ کیسے بھول گئے؟"۔ اسکا انداز طنزیہ تھا۔ وہ اسکے انداز کو دیکھ کر مسکرایا پھر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ اماں بتا رہی تھیں کہ تمہیں بخار ہے؟"

"ہمیش خان! ہر بات کا پتہ تمہیں اماں سے ہی کیوں چلتا ہے؟ کبھی اپنی آنکھیں اور کان بھی کھلے رکھا کرو"۔ وہ اسکے غصے سے بھرپور انداز کو دیکھ کر ہنس دیا۔

"ویسے تم کہیں میری اور مریم کی دوستی کی وجہ سے تو۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہیں تم نے ہماری دوستی کو خود پہ حاوی تو نہیں کر لیا کہ بخار جان ہی نہیں چھوڑ رہا"۔ وہ سنگل صوفے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"تم جانو اور تمہاری مریم خان، مجھے کیوں پروا ہونے لگی تم لوگوں کی"۔ وہ تڑخ کر بولی۔

"اچھا۔۔۔۔ ویسے پتہ نہیں کیوں۔۔۔۔۔ مجھے لگ رہا ہے کہ تم جل رہی ہو"۔ وہ طنز کرنے سے کب باز آتا تھا۔

"جلتی ہے میری جوتی"۔ وہ غصے سے بولی۔

"اوہ۔۔۔۔۔۔اِتنی محبت ہے مجھ سے کہ جوتی بھی جلتی ہے۔۔۔۔یہاں تو معاملہ ہی اُلٹا ہو گیا"۔ وہ اسے تولتی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"محبت۔۔۔۔۔ محبت کا لفظ میری ڈکشنری میں نہیں ہے ہمیش خان! اور وہ بھی تمہارے ساتھ تم۔۔۔۔ تم دِن رات مریم خان کیساتھ عشق کی پینگیں بڑھا رہے ہو"۔ وہ لفظوں کو چبا چبا کر بولی تو ہمیش خان کو یوں محسوس ہوا کہ اسکے دماغ کی کوئی نس پھٹ گئی۔

"اوہ یو شٹ اَپ۔ حد میں رہو اپنی۔ خبردار آج کے بعد مریم خان کیلئے اس قسم کا کوئی بیہودہ لفظ استعمال کیا تو۔۔۔۔۔۔۔۔"۔ وہ پھٹ پڑا۔

"میں اپنی حدود کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم ہی اپنی حدود سے نابلد ہو"۔ اسکا غصہ دیکھ کر گل زریں کے ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔

"میں تمہیں آخری بار تنبیہ کر رہا ہوں مریم خان کے حوالے سے آئندہ ایسی کوئی بات مت کرنا ورنہ نتائج کی ذمہ دار تم خود ہو گی"۔ وہ غصے سے دھاڑا۔

"ہمیش خان یونیورسٹی میں مریم خان اور تم بہن بھائی مشہور ہو۔ میرے ساتھ کیا جھوٹ بولو گے کیونکہ میں تو تمہاری اور مریم خان کی حقیقت جانتی ہوں ناں"۔ وہ تنک کر بولی۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جھوٹ بولنے کی؟ مرم خان میری عزت ہے نہ صرف میری بلکہ حویلی کی بھی کیونکہ تم جانتی ہو کہ خانوں کی عزت انکی حویلی اور خاندان کی بھی عزت ہوتی ہے"۔ وہ رُکا نہیں چلا گیا اور وہ اسکے لفظوں پر غور کرتی رہ گئی۔

"یہ کیا کہہ گیا ہے ہمیش خان۔۔۔۔ عزت۔۔۔۔۔ تو کیا مریم خان اور ہمیش خان نے نکاح۔۔۔۔۔۔؟اُوہ میرے خدا یہ کیسے ممکن ہے؟"۔

وہ رات بھر سوچتی رہی جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ بخار ٹھیک ہونے کی بجائے لمبا ہوتا چلا گیا۔ جب اسکا میڈیکل سرٹیفیکیٹ یونیورسٹی پہنچا تو دوسرے ہی دِن اسکی دوست شائستہ شنواری اسکا حال چال پوچھنے حویلی آدھمکی۔

"کیا حال بنا رکھا ہے تم نے۔۔۔۔۔۔۔؟ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پیپرز شروع ہونیوالے ہیں اور محترمہ ہیں کہ ٹھیک ہوتی دِکھائی نہیں دے رہیں"۔ وہ اِسے پیار بھرے انداز میں ڈانٹ رہی تھی۔

"ہوں۔۔۔۔اچھا" وہ مسکرائی۔ "اچھا سناؤ یونیورسٹی کیسی جا رہی ہے؟"۔ وہ جو چائے کی پیالی اُٹھا رہی تھی مسکرانے لگی۔

"یونیورسٹی۔۔۔۔۔اے ون۔۔۔۔۔آجکل بڑہ ہلچل مچی ہے زوالوجی ڈپارٹمنٹ میں"۔ وہ چونکی۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"وہی ہمیش خان اور مریم خان کا قصہ۔۔۔ مریم خان جس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے ہمیش خان کو وہ سخت ناپسند ہے اسلئے آجکل دونوں ایک دوسرے سے دور دور ہیں"۔ وہ ٹھٹکی۔ "کہاں تو بہن بھائی سائے کی طرح ایک دوسرے کیساتھ چپکے رہتے تھے کہ ہم جیسے دور سے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے اور کہاں؟"۔ وہ ایک لمبی آہ بھر کر رہ گئی۔

"ہمیش خان کی کوئی بہن نہیں ہے شائستہ"۔ وہ دُکھ سے بولی

"چھوڑو یار! لگتا ہے ادھر بھی کوئی ایسا ہی سلسلہ ہے۔ ویسے یار قصور تمہارا بھی نہیں۔ بندہ ہے ہی ایسا سحر انگیز شخصیت اور پھر ہر وقت ناک پر دھرا غصہ کہ ہر کوئی بلاشرکت غیرے اسکا مالک بانا چاہتا ہے"۔ وہ عقیدت آمیز لہجے میں بولی۔

"یہاں ہر کوئی بننا چاہتا ہے نا لیکن ڈیئر شائستہ شنواری، ہمیش خان خود بلاشرکت غیرے میرا مالک بن چکا ہے"۔ وہ شیریں لب و لہجے میں بولی تو شائستہ کو افسوس ہونے لگا۔

"اِتنا سوچو گی اسکے بارے میں تو بخار تو مشکل ہے کہ اُترے"۔ وہ اسکی بات سن کر لب کچلنے لگی۔

"وہ صرف میرا یونیورسٹی فیلو ہی نہیں میرا چچازاد بھی ہے اور اور۔۔۔۔۔۔۔ اسکے ساتھ ساتھ میرا شوہر بھی"۔ اسکے الفاظ تھے کہ کوئی ایٹم بم۔

"کیا کہا تم نے؟ لگتا ہے بخار تمہارے سر کو چڑھ گیا ہے"۔ وہ اسکی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بوکھلا اُٹھی۔

"نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں تو بس اِتنا جانتی ہوں کہ زندگی کا لطف عشق کیساتھ ہے۔ اگر عشق نہ ہو تو زندگی بے سود و زیاں ہے، بے نور ہے، ظلمات سے بھی بدتر ہے۔ کاش۔۔۔۔۔ کاش میں محبت میں اِتنی بااِختیار ہوتی کہ وہ میرے دِل میں اور میں اُسکی آنکھوں میں ہوتی"۔

اسکا لہجہ پریقین اور وثوق بھرا تھا جسے محسوس کر کے شائستہ مسکرا دی۔

"میری تمام دُعائیں اپنی دوست کیلئے ہیں بس اِتنا یاد رکھنا۔ کہ وقت پر وقت کو ساتھ بنا لو تو وقت تمہارا ہو گا کیونکہ جو وقت کو مٹھی میں بند کرتا ہے وقت اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ وقت بے پرواہ ہے گل زریں، یہ کسی کا اِنتظار نہیں کرتا۔ اسلئے اس سے قبل سے وقت تمہاری نازک ہتھیلی سے

سرک جائے اسے مضبوطی سے تھام لو۔ اپنی محبتوں، اپنی وفاؤں اور اپنے ولولوں کو ہمیش خان تک پہنچاؤ۔ ایسا نہ کہ خانوں کی ریت کے مطابق صرف حویلی تک محدود رہ جاؤ"۔ وہ اسے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنے میں مدد دے رہی تھی اور گل زریں چپ چاپ زندگی کی گزرتی ساعتوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پتھر میں جونک لگ سکتی ہے، سنگلاخ چٹانوں کو چیر کر کوئی نرم و نازک پودا نشوونما پا سکتا ہے مگر جنکے دل پتھر ہو جائیں ان میں نرمی و گداز پیدا کرنا آسان کام نہیں۔

وقت ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا تھا۔ ان دونوں کا ماسٹرز مکمل ہو گیا تو حقیقتاً حویلی کے در و دیوار دہل کر رہ گئے۔

"آغا جی اب مریم کی پڑھائی مکمل ہو چکی ہے۔ میں اسے حویلی لانا چاہتا ہوں"۔ وہ ہمایوں خان کے سامنے بیٹھا سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"ہمیش خان یہ کیسے ممکن ہے؟"۔ وہ نہایت تحمل سے بولے۔ انکی کنپٹی کی ابھرتی رگ انکے ضبط و استقامت کی گواہ تھی۔

"اس میں ناممکن کیا ہے آغا جی؟ وہ میری عزت ہے اور اسی حوالے سے اس حویلی کی بھی عزت ہے"۔ آہستہ آہستہ لیکن مدلل انداز میں اپنی بات سمجھا رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔۔۔ نہ وہ تو ہماری عزت ہے، نہ تمہاری اور نہ اس حویلی کی۔ انہوں نے تمہیں بھی خرید اہے ہمیش خان اس محبت کا واسطہ دے کر جو تمہیں اس خاندان سے ہے"۔

"چلیں ایسا ہی صحیح آغا جی لیکن میں جلد ہی مریم کو حویلی لا رہا ہوں"۔ وہ دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"تم ہماری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔ ہم ایسا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے جس سے حویلی کی شان و شوکت میں فرق آئے"۔ وہ چلائے۔

"آپ سے فیصلہ کروانے کون آیا ہے آغا جی؟ میں تو صرف اپنا فیصلہ اس دفعہ سنانے آیا ہوں"۔ وہ غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "آغا جی آپ نے گل زریں کو یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی اجازت دی میں کچھ نہیں بولا، آپ نے اس سے میرا نکاح کیا میں خاموش رہا اور آپکی خوشی کو مقدم جانتے ہوئے آپکی خوشی کا تاثر دیا۔ آغا جی اب مریم خان میری خوشی ہے تو آپ بھی میری خوشی پر خوش ہوں کیونکہ مریم خان کے معاملے میں، میں خاموش نہیں رہ سکتا۔

"ہمایوں خان آفریدی اِتنا کمزور نہیں ہوا کہ دوسروں کے فیصلوں پر عمل کرتا پھرے"۔ وہ غصے سے دھاڑے لیکن مقابل بھی ہمیش خان تھا جس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"آغاجی! دو دِنوں تک مریم حویلی میں ہو گی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ میری خواہش اور خوشی کو مقدم جانتے ہوئے اِجازت دے دیں کیونکہ اگر آپ نے مجھے اِجازت نہ دی تو میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ گل زریں کو طلاق دے دوں گا"۔ وہ رُکا نہیں لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا جبکہ ہمایوں خان آفریدی کا جاہ چشم انکی قدم بوسی کو نیچے آرہا تھا۔

خوشی نہیں آئی اور زندگی کی اُمید بھی چلی گئی۔ غم ویسے ہی راستے مسدود کئے کھڑا ہے، زندگی کی ساعتیں گزرتی چلی جارہی ہیں۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ مریم خان حویلی آچکی تھی۔ گل زریں کا گھر بچانے کیلئے آغاجی اسکی دُشمنِ جاں کو خود حویلی لیکر آئے لیکن گل زریں نے اسکے سامنے جانا مناسب نہ سمجھا۔ داور خان پورے دِن کیساتھ شہر والی حویلی میں شفٹ ہو گیا تھا۔ آغاجی نے آہستہ آہستہ اسکو (مریم خان کو) اسکا درجہ دینا شروع کر دیا تھا۔

"کیسی ہو گل زریں؟ مجھے اِتنے دِن ہو گئے حویلی میں آئے ہوئے لیکن تم سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی"۔ مریم اسے سیڑھیاں اترے دیکھکر بولی۔

"ہمیش خان سے تو ملاقات ہوتی ہے نہ تمہاری"۔ وہ اپنے لہجے کی ناگواریت کو چھپاتے ہوئے بولی۔

"ہاں وہ تو روز ہی ہوتی ہے۔ پتہ ہے گل زریں میں نے کبھی ایسی شان و شوکت والی زندگی کا سوچا بھی نہیں تھا لیکن جب خوش قسمتی ساتھ دے اور وقت کے چراغ روشن ہوں تو قسمت کے موتی ضرور مل جاتے ہیں"۔ وہ گل زریں کیساتھ چلتے چلتے بولی تو اس نے بغور اسکے چہرے کی جانب دیکھا جو بہت معصوم تھا۔ اس پل اسکے چہرے پر کئی رنگ برے تھے شاید قسمت کے موتی پانے کے رنگ یا ہمیش کی محبت کے رنگ۔ وہ دن بدن نکھرتی جارہی تھی جبکہ گل زریں خود دن بدن نکھرتی جارہی تھی۔

"قسمت کی دیوی کبھی کبھی الٹا چکر بھی دیتی ہے مریم خان! سپیرے کی موت ہمیشہ سانپ کے کاٹنے سے ہوتی ہے لیکن سانپ بھی زخم کھا کر ہی مرتا ہے۔ گلاب کے کانٹے اسکے پھول کے رکھوالے ہوتے ہیں لیکن موت کا ذائقہ اکثر وہ مالی کے ہاتھوں چھکتا ہے۔ وہ لاؤنج کا دروازہ کراس کرتی چلی گئی جبکہ مریم خان حیران و پریشان اسکی باتوں پر غور کرتی جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔

کسی نے زور سے دروازہ کھولا اور آندھی کی طرح اندر داخل ہوا۔

"کیا کہا ہے تم نے مریم سے بولو؟" ہمیش خان غصے سے بولا جبکہ وہ حیران پریشان اسکی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"میں کیوں کچھ کہنے لگی اس سے، اسکا رشتہ ہے مجھ سے جو میں اسے کچھ کہوں گی؟" وہ بیڈ سے اُٹھ کر اسکے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"تمہیں کوئی حق بھی نہیں کہ اُسے کچھ کہو اور برائے مہربانی آئندہ اس سے کوئی بکواس کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ........"

"ورنہ........ ورنہ کیا کر لوگے تم میرا...... جو ہے وہ تو نظر آتا ہے ہمیش خان"۔ وہ استہزائیہ انداز سے بولی۔

"کرنے کو تو میں بہت کچھ کر سکتا ہوں گل زریں آفریدی! اور جو تمہیں نظر آتا ہے وہ تمہاتے نظر کا فتور ہے"۔ اسکے خشک لہجے میں اب بھی شعلوں کی سی تپش تھی۔

"ہو گا میرے دماغ کا فتور، تم جاؤ اور جا کر اپنی مریم خان کو چپ کراؤ۔ ٹسوے بہار ہی ہو گی بیٹھ کر"۔ وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی۔

"شٹ اپ۔ تمہارے دماغ میں جس شک کے کیڑے نے کلبلی مچار کھی ہے نا میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں یہ الگ بات ہے تم نہ مانو"۔ وہ اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا تو پل بھر کو وہ لرز گئی لیکن پھر ہمت کر کے گویا ہوئی۔

"کیا جانتے ہو تم؟ بولو؟"

"یہی کہ تم ہمیش خان"، اس نے کچھ لمحے توقف کیا تو وہ سٹپٹا گئی۔ "یہی کہ تم ہمیش خان کی محبت میں بہت آگے تک نکل چکی ہو لیکن اِتنا یاد رکھنا گل زریں! جب تک مریم کو اسکا مقام تم نے نہ دیا، میری نظروں میں تمہاری اِتنی سی بھی عزت نہیں ہو گی اور محبت تو بہت دور کی بات ہے"۔ وہ ہاتھ کے اِشارے سے اسکی طرف دیکھ کر بولا۔

"تم سے محبت کون مانگ رہا ہے خان؟ تم تو نفرت دینے کے بھی قابل نہیں"۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی تو اس نے اُس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ اپنا سر پکڑ کر وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی۔

وہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی۔ ٹھٹھرتی ہوئی رات، بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج، آندھی کا شور اور بارش کا زور۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی چھت پھٹ جائے گی۔ پورِدل کی طبیعت خراب تھی۔ اماں بی، گل زریں کی والدہ اور آغا جی سب شہر گئے تھے جبکہ گل زریں، مریم خان اور ہمیش خان حویلی میں تھے۔ بادل یوں گرج رہے تھے کہ کان پڑتی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ لائٹ چلی گئی۔ گل زریں نے کینڈل جلانے کیلئے ماچس تلاش کی لیکن اسے نہ ملی۔ وہ ماچس لینے کیلئے کچن کی جانب جا رہی تھی کہ بلا ارادہ اسکے قدم مریم خان کے کمرے کے سامنے رُک گئے۔ اندر سے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اسطرح آ رہی تھی جیسے کوئی بہت تکلیف میں ہو۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ دھکیلا تو دروازہ کھلتا چلا گیا لیکن اندر کا منظر دل دہلا دینے والا تھا۔

"اچھا اب راتوں کو چھپ چھپ کر خانوں کی حویلی میں یہ سب کچھ ہو گا"۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ خاموش نہ رہ سکی۔ اسکی آواز سن کر ایک دفعہ تو مریم خان اور ہمیش خان جی جان سے لرز گئے۔

"تم راتوں کو چھپ چھپ کر ہماری جاسوسی کر رہی ہو"۔ ہمیش مریم کو بیڈ پر بٹھا کر اسکی طرف لپکا۔

"سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے ہمیش خان! حقیقت آج میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ تم سب کی غیر موجودگی کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہو"۔ ہمیش خان کو نائٹ گاؤن اور مریم خان کو بغیر ڈوپٹے کے بیڈ پر بیٹھے دیکھ کر اسکی آنکھوں میں لہو اتر آیا تھا۔

"تم حقیقت نہیں جانتی گل زریں! جاؤ جا کر اپنا کام کرو"۔ اس نے جب گل زریں کو جانے کا کہا تو اسکے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"اسلئے چلی جاؤں کہ تمہارے کچھن نہ دیکھ سکوں۔ تمہارے کرتوتوں سے دوسروں کو آگاہ نہ کر سکوں یا پھر تمہاری ان منائی جانیوالی رنگ رلیوں پر پردہ ڈال دوں"۔

اسکی اِلزام تراشیوں پر اسکے دماغ کی رگیں تن گئی تھیں۔ وہ بات کاٹ کر گرجتے ہوئے بولا۔

"سٹاپ اٹ۔ کیا تم اپنے الزام کی وضاحت دینا پسند کرو گی؟"۔

"وضاحت۔۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ جب سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں تو وضاحت کیسی اور اِلزام کیسا؟"
وہ غصے سے دھاڑا اور ہاتھ کا نشان اسکے منہ پر چھوڑ گیا۔
"نہیں ہمیش خان! اب میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ بہت برداشت کیا ہے میں نے۔ اب مزید نہیں"۔ اپنے گال پر ہاتھ رکھے وہ کراہی۔
"دیکھو گلِ زریں! تم غلط سمجھ رہی ہو۔ دراصل لائٹ چلی گئی تھی اور ہمیش خان جانتا تھا کہ مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے تو وہ فوراً میرے کمرے میں چلا آیا"۔ مریم جو کب سے خاموش بیٹھی تھی صفائی دینے کو آگے بڑھی۔
"تم اپنے کام سے کام رکھو۔ مجھے سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو"۔ اس نے اُنگلی اُٹھا کر اسے متنبہ کیا۔
"تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو گلِ زریں! خومخواہ ایک غلط بات کو طول دے رہی ہو۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں نہ کہ لائٹ چلے جانے کی وجہ سے۔۔۔۔۔"
وہ گل زریں اور ہمیش کے نازک رِشتے کا احساس کرتے ہوئے بات کو ختم کرنا چاہ رہی تھی لیکن گل زریں نے اسے ٹوک دیا۔
"لائٹ جانے کی وجہ سے وہ تمہیں اپنی روشنی سے نوازنے آ گیا مریم خان، یہی بتانا چاہ رہی ہو نہ تم۔ اور ہمیش خان تم۔۔۔۔۔۔ تم نہایت کی گھٹیا، بُرے کردار کے مالک اور گرے ہوئے اِنسان ہو"۔
"شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ"۔ ہمیش خان غصے سے دھاڑا اور آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اسکے کمرے کی طرف چل دیا۔ مریم راستے میں آئی تو ہمیش نے اسے دھکا دے کر نیچے گرایا اور خود گل زریں کو لیکر چل دیا۔
باہر آندھی کا شور تھا، بادلوں کی گرج تھی، بجلی کی چمک، بارش کا زور، ایک دِل دہلا دینے والا منظر اور اس سے بھی خوفناک منظر اسکا منتظر تھا۔
"چھوڑو مجھے"۔ وہ اس سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسکی مردانہ گرفت بہت مضبوط تھی۔
"اتنی جلدی کیسے چھوڑ دوں میری جان! ابھی تو تم نے میرا بُرا پن دیکھا ہی نہیں ہے۔ رنگ رلیاں کیسے مناتے ہیں یہ بھی بتاؤں گا اور میرے لچھن وہ تو خیر تم جان ہی چکی ہو"۔ وہ اسے اسکی کہی باتیں لوٹا رہا تھا۔

"میں کہتی ہوں چھوڑو مجھے"۔ وہ اسکے جارحانہ عزائم دیکھ چکی تھی اور حقیقتاً خوفزدہ بھی ہو رہی تھی۔ اس نے اسے بیڈ پر پٹخا اور اندر سے دروازہ لاک کر لیا۔ اسکے چہرے پر خطرناک عزائم کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ آگے جھک کر اسکے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں جکڑ لیا۔ وہ بری طرح مچلنے لگی۔ قیامت آئی اور گزر گئی۔ اسکی آہ و واویلا اسکے کسی کام نہ آسکا اور وہ کسی ساکت پنچھی کی طرح اسکے سامنے ڈھیر ہوتی چلی گئی۔ اسکا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس نے کسی ہارے ہوئے پنچھی کی طرح اپنے وجود کو سمیٹنا چاہا لیکن بے سود۔

اسکی انا، اسکی نسوانیت سب کچھ تہہ تیغ ہو گیا اسکے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا تھا۔

جب اسکی ماں، آغاجی اور اماں بی گھر واپس آئے تو وہ بخار میں بے سدھ پڑی تھی۔ مریم پاس ہی بیٹھی اسکے ماتھے پر پٹیاں بھگو بھگو کر رکھ رہی تھی جبکہ ہمیش خان ڈاکٹر کو چھوڑنے گیا ہوا تھا۔ وہ سب اسکی ایسی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ آہستہ آہستہ اسکا بخار ٹھیک ہو گیا لیکن وہ یکسر بدل چکی تھی۔ اسکی ضد، طنطنہ، غرور کہیں دور جا کر سو گئے تھے۔ وہ گھنٹوں اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھی رہتی یا پھر باداموں کے باغ میں جا کر کسی ایک نقطے پر نگاہوں کو مرکوز کر لیتی کہ کسی کے جھنجھوڑنے پر اٹھ کر حویلی کی طرف آجاتی۔ اسکی یہ حالت دیکھ کر اس کی ماں، اسکی ساس، اماں بی اور آغاجی گھٹ گھٹ کر جی رہے تھے۔ وہ ہمیش خان اور مریم خان کے سامنے آنے سے کتراتی تھی جبکہ ہمیش خان اندر ہی اندر خود کو اسکی اس حالت کا ذمہ دار قرار دے چکا تھا کہ ایک دن حویلی میں بھونچال آگیا۔

وہ باغ کی طرف جا رہی تھی کہ ہمیش خان سے سامنا ہو گیا۔ وہ اسکی طرف بڑھا۔

"کیسی ہو گل زریں؟"۔ اسکی آواز سن کر اس نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔

"برباد ہونیوالوں سے یہ نہیں پوچھا کرتے ہمیش خان کیونکہ انکا چلتا پھرتا وجود بربادی کا پتہ دے رہا ہوتا ہے۔ جو بھی ہوا بہت برا ہوا، بہت غلط ہوا ہمیش خان"۔

"میں تمہارا شوہر ہوں گل زریں! وہ سب میرا حق تھا۔ تم نے اتنی چھوٹی سی بات کو ذہن پر سوار کر لیا ہے"۔ وہ اسکی حالت دیکھ کر بہت رنجیدہ ہو رہا تھا۔

"حق ایسے وصول نہیں کیا جاتا ہمیش خان! اور وہ چھوٹی سی بات کب تھی؟ میری عزت، میرا وقار، میری خودداری و نسوانیت سب کچھ تو تم نے داؤ پر لگا دیا۔ تم کہتے ہو وہ چھوٹی سی بات ہے، یہ سب کچھ اگر تمہاری مریم خان کیساتھ ہوتا تو میں تمہیں پوچھتی"۔ اس نے لب و لہجے کو مکمل طور پر نارمل رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"مریم خان کا ذکر بیچ میں کہاں سے آ گیا؟ وہ دن رات تمہاری پٹی سے لگی رہی کیا اس نے برا کیا؟ گھر والوں کو حوصلہ دیا۔ وہ تو خود ٹوٹی پھوٹی ہوئی ہے۔ اسکے ساتھ تو حادثات کیا تنی دھول چھکی تھی کہ اپنا اصل نام و نشان تک بھول گئی۔ وہ زندگی سے روٹھ رہی تھی گل زریں اور میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں اسے زندگی کی طرف لانے کی جستجو میں لگا رہا اور اسے حویلی لے آیا گل زریں۔۔۔۔۔۔ رئیلی سوری میں۔۔۔۔۔۔" وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن وہ خونخوار انداز لئے اس سے گویا ہوئی۔

"نہیں ہمیش خان ایک لفظ بھی نہیں۔ تمہاری سوری میری ذات کی اُڑائی گئی دھجیوں کو نہیں سمیٹ سکے گی۔ تمہاری ندامت کبھی بھی مجھے اپنی نظروں میں باکردار ثابت نہیں کر سکے گی۔ میں ہر الزام سہہ لوں گی لیکن تمہارے اور مریم خان کے درمیان سے ہٹ جاؤں گی کیونکہ قصور میرا ہے کہ تم جیسے پتھر دل انسان سے محبت کر بیٹھی۔ میں تمہیں کی دھڑکنوں میں نئے رنگوں کیساتھ سجا کر تختہ ستم پر بٹھا دیا۔ تم تو میرے لئے وہ قوت تھے ہمیش خان جس نے میری محبت کو طرح طرح کے رنگوں سے نوازا تھا لیکن تم کیا نکلے۔۔۔۔۔۔" وہ رو پڑی۔

"گل زریں! تم بے فکر رہو تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ میں آغا جی سے رُخصتی کی بات کرتا ہوں"۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا تو وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"ہمیش خان تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنی نظروں میں بہت گر گئی ہوں دوبارہ نہیں اُٹھ سکوں گی۔ اسلئے تم سکون سے اپنی زندگی مریم خان کیساتھ گزار سکتے ہو"۔ وہ تھوڑی دیر کو رُکی۔ "اسلئے کہ تمہارا دل مریم خان کیساتھ دھڑکتا ہے۔ تم نے بات یونیورسٹی تک محدود نہیں رکھی بلکہ مریم خان کو حویلی میں لے آئے۔ میں اس خاندان کی روایتوں سے واقف ہوں خان! مرد لوگ باہر عیاشی کرتے ہیں لیکن عیاشی کا سامان حویلی لانے سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں۔ تم نے تو باپ دادا کی عزت کا بھی خیال نہ کیا اور اس گناہوں کی پوٹلی کو حویلی اُٹھا لائے۔۔۔۔۔"

"بس گل زریں! چپ ہو جاؤ۔ اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کر سکتا"۔ وہ اسکی بات سن کر غصے سے دھاڑا جبکہ باہر نکلتی مریم، گل زریں کی باتیں سن کر وہیں زمین بوس ہو گئی۔ وہ اسکی طرف بھاگا۔

"مریم۔۔۔۔ مریم آنکھیں کھولو۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟" وہ اندر کی طرف بھاگا جبکہ گل زریں حیران و پریشان کبھی مریم کی طرف دیکھتی اور کبھی دروازے کی جانب جہاں سے ہمیش خان اندر گیا تھا۔

"آغا جی، اماں بی پتہ نہیں مرکو کیا ہو گیا ہے"۔ وہ رو رہا تھا۔ سب باہر کی طرف بھاگے اس نے جلدی سے بے ہوش مریم کو اُٹھایا اور گاڑی میں ڈال کر اندھا دھند شہر کی جانب چل دیا۔

"کیس بہت پیچیدہ ہے ہمیش آفریدی۔ مریضہ کے دِل کے دو والو پہلے ہی بند ہیں۔ ہمیں فوراً آپریشن کرنا ہو گا۔ آپ ہمیں اِجازت دیں"۔ ڈاکٹر معاذ اسی سے مخاطب تھے۔

"پلیز ڈاکٹر جلدی کریں"۔ اس نے جلدی جلدی انہیں فائل پہ دستخط کر کے دیئے۔

"آپ لوگ دُعا کریں"۔ ڈاکٹر فائل پکڑتے ہوئے بولا اور آپریشن تھیٹر کی جانب چل دیا۔

ایک۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔ تین۔۔۔۔۔ چار۔۔۔۔۔ پانچ۔۔۔۔۔ چھ گھنٹے تک مسلسل آپریشن ہوتا رہا جبکہ وہ تمام لوگ آپریشن تھیٹر کے باہر مریم کی زندگی کی دُعائیں مانگتے رہے۔ وہ کوریڈور کے آخری کونے میں کھڑی مریم خان کی زندگی کیلئے دل سے دعا مانگ رہی تھی جب ہمیش خان اسکی جانب بڑھا۔

"اگر مریم کو کچھ ہو گیا نا۔۔۔۔ تو گل زریں بیگم میں تمہیں ساری زندگی معاف نہیں کروں گا۔ ایسی سزا دوں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گی۔ بڑی مشکل سے میری بہن مجھے ملی تھی گل زریں، میں نے دن رات اسے تلاش کیا تھا جب وہ مجھے ملی تھی ناں تو زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ اسے میں زندگی کی جانب لایا۔ وہ اِتنی چھوٹی سی عمر میں ہارٹ پیشنٹ تھی۔ اس سے قبل دو ہارٹ اٹیک ہو چکے ہیں اسے ایک اماں کی وفات پہ اور ایک۔۔۔۔ اگر۔۔۔۔۔۔۔۔ میری مریم کو کچھ ہو گیا تو بخشوں گا تمہیں بھی نہیں۔ سنا تم نے۔۔۔ میں نے اسکی خاطر اپنی ساری دوستیاں ختم کر ڈالیں۔ اب اگر۔۔۔۔ نہیں میری مریم کو کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ تم جانتی ہو زریں کہ خان جب تک اپنے دشمن سے انتقام نہ لے لے نہ

سوتا ہے نہ کھاتا ہے اور نہ ہی چین سے بیٹھتا ہے"۔ اسکا انکشاف واقعی دل دہلا دینے والا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سوچتی اسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ قبل ازیں وہ فرشش کی جانب لڑھکتی پاس کھڑی پوردِل نے اسے اپنے ہاتھوں سے تھام لیا۔

"ان حالات میں ایسا ہو جاتا ہے بیگم صاحبہ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں چند ادویات لکھ رہی ہوں ان سے جلد ہی انکی کمزوری دور ہو جائے گی"۔

اسکی ماں اور پاس بیٹھی پوردِل کے چہروں پر کوئی سایہ سا آکر گزر گیا۔

"کیا مطلب؟ میں آپکی بات سمجھی نہیں"۔ پوردل نے ہمت کر کے بولی۔

"آپکی بہن اُمید سے ہیں"۔ یہ سننا تھا کہ گل زریں اپنے حواسوں میں آگئی۔ وہ دونوں چپ چاپ خود کو گھسیٹ کر باہر لے آئیں۔ باہر نکلنے کی دیر تھی کہ اسکی ماں یوں گریں کہ دوبارہ نہ اُٹھ سکیں جبکہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر ماں سے لپٹی جا رہی تھی۔

حویلی میں دو لاشیں اکٹھی آئیں تو کہرام برپا ہو گیا۔ آغاجی کبھی گل زریں کو دلاسہ دیتے کہ ماں کے بعد وہ تنہا ہو گئی تھی کبھی ہمیش خان کو گلے لگاتے کہ جوان بہن کی موت کا غم کسی بھی طرح کم نہ ہونیوالا تھا۔

گزرتے دِنوں کیساتھ ساتھ سب کو آہستہ آہستہ قرار آ گیا لیکن شاید امتحان جلدی ختم نہیں ہوتے۔ گل زریں نے سلیپنگ پلز کھالیں۔ اگر اس دن پوردل اسکے کمرے میں نہ جاتی تو شاید بہت دیر ہو جاتی۔ ڈاکٹرز نے اسے بچا لیا اور اس ننھی کونپل کو بھی جو اسکی سانسوں میں خوشبو لے رہی تھی لیکن ہمیش خان نے اس بات کو ایشو بنا کر گل زریں سے شادی سے انکار کر دیا۔ گل زریں نے اس سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"ہمیش خان تم مجھ پر بہتان لگا رہے ہو۔ کیا نہیں جانتے کہ یہ بچہ کس کا ہے؟" وہ اسے دلائل دے رہی تھی۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نہ کہ اگر مریم کو کچھ ہو گیا تو بخشوں گا میں تمہیں بھی نہیں"۔ وہ دو ٹوک فیصلہ کر چکا تھا۔

"تم جانتے ہو میں حقیقت سے آگاہ نہیں تھی اور جب مجھے حقیقت کا پتہ چلا تو بہت دیر ہو چکی تھی"۔ وہ اسے کسی بھی طریقے سے روکنا چاہ رہی تھی۔

"تم نے اپنے اندر خواہشوں کیا یک دنیا بس رکھی تھی گل زریں یہ جانے بغیر کے خواہش کا ہر پل خواہش کی ایک دنیا ہے اور خواہش کی دنیا زندگی کی ایک جھلک ہے اور زندگی۔۔۔۔۔۔ گل زریں زندگی ہر پل خواہش کا امتحان ہے"۔ وہ اسے ایک نئے فلسفے میں الجھا کر فرار چاہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے خان! اگر خواہش کا انجام رسوائی ہے تو میں محبت اور خواہشوں کے اس جہاں میں رساہی خوش ہوں۔ جانے سے قبل اتنا کر دو کہ گھر والوں کو اس حقیقت سے آگہی دے دو جو صرف تم اور میں جانتے ہیں"۔ اسکے لہجے میں عجیب سی چبھن تھی۔

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس بچے سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہوگا"۔ وہ کڑے تیوروں سے بولا۔

"ٹھیک ہے ہمیش خان ایسا ہی سہی پھر صرف ایک کام اور کر دو۔ اپنی زبان کو کاٹ کر کہیں پھینکو دو کیونکہ جس زبان کیساتھ حق کی بات نہ کی جائے اسے سرے سے کاٹ دینا اچھا ہوتا ہے"۔ وہ سنجیدگی سے بولی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آگے کا راستہ کانٹو بھرا ہے اور اسکے پاؤں آبلہ پا ہوں گے لیکن وہ بے بس تھی، مجبور تھی۔ آج اسے ہمیش خان اس بڑے پتھر کی طرح لگ رہا تھا جو ہمیشہ ندی کی تہہ میں دھنسا ہوتا ہے لیکن جب اسے ہلا دیا جائے تو ساری ندی موج موج اور تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔ وہ رکا نہیں چلا گیا سارے کانٹے اسکی جھولی میں ڈال گیا۔ یہ جانے بغیر کے اسکے پاؤں پہلے پہ زخمی ہیں کانٹوں کو چنتے چنتے ہاتھ زخمی اور آنکھیں اندھی کرلے گی۔

خوشنود آفریدی خان کی جب دو سال تک اولاد نہ ہوئی تو اس نے شہر میں ایک بے سہارا عورت کی بیٹی سے شادی کر لی۔ ادھر اس سے شادی کی اُدھر زرینہ بی (بی اماں) اُمید سے ہو گئیں۔ داور خان کی پیدائش کے کچھ ماہ بعد ہی شہر والی بیوی کے ہاں مریم خان نے جنم لیا۔ زرینہ بی ہاں داور خان کے بعد کوئی اولاد نہ ہوئی جبکہ ندرت بانو کے ہاں مریم خان کے بعد ہمیش خان نے جنم لیا۔ خوشنود آفریدی، ہمیش آفریدی اور مریم خان کو حویلی میں لانا چاہتے تھے لیکن انکے باپ نے اجازت نہ دی۔ باپ کی وفات کے بعد ندرت بانو نے اس شرط پر ہمیش خان کو اسکے حوالے کیا کہ مریم خان ماں کے پاس ہی رہے گی۔ خوشنود خان جب تک زندہ رہا اپنی بیوی اور بیٹی سے ملنے شہر جاتا رہا جبکہ ہمیش خان کو اسکے متعلق کچھ نہ بتایا۔ پوردل اور داور خان کے نکاح سے ایک دن پہلے خوشنود خان نے ساری کہانی ہمیش کو سنا ڈالی اور وعدہ کیا کہ وہ ہمیش خان کو اسکی ماں

اور بہن سے ضرور ملوائے گا لیکن انہیں زندگی نے مہلت نہ دی۔ ایک حادثے میں اپنی زندگی ہار گئے۔ ہمیش خان کو چند سالوں بعد اپنے باپ کے ایک دوست کے ذریعے اپنی ماں اور بہن کا پتہ چلا۔ وہ ملنے گیا تو اسکی ماں زندگی کی بازی ہار چکی تھی جبکہ اسکی بہن ایک خستہ حال مکان میں زندگی سے مایوس ہو کر دن پورے کر رہی تھی۔ وہ بہت حساس تھی۔ ہمیش خان اسے زندگی کی طرف واپس لانے کیلئے تگ ودو کرنے لگا۔ اسے نئے سرے سے پڑھائی کی طرف راغب کیا۔

وہ اپنی بہن کی حالت دیکھ کر اندر تک لرز جاتا اور جب ڈاکٹرز نے بتایا کہ اتنی چھوٹی عمر میں دو ہارٹ اٹیک ہونے کی وجہ سے دل کے دو والو بند ہو چکے ہیں۔ وہ بہت مایوس ہو گیا لیکن اپنی محبتیں اور اُلفتیں اپنی بہن پر لوٹاتا چلا گیا۔ گل زریں کی باتیں اسے اندر سے کمزور کرتیں لیکن وہ اس وقت تک اسے حقیقت نہیں بتانا چاہتا تھا جب تک مریم کو اسکا اصلی مقام نہ دِلا دیتا لیکن جب مریم کو اسکا اصل مقام ملا گل زریں اس وقت شکوک و شبہات کی زد میں اسطرح پاؤں پاؤں دھنس چکی تھی کہ باہر نہ نکل سکی اور اسکی زہر اُگلتی زبان اور شعلے ٹپکاتی آنکھوں سے مریم خان اپنے وجود کو بچا نہ سکی اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بھائی کو تنہا چھوڑ گئی اور گل زریں کے حصے میں بھی صرف خسارہ ہی آیا۔

"دیکھو گل زریں! باہر نکلو۔ بیٹا کب تک کمرے میں یوں ہی بند پڑی رہو گی؟"۔ اماں بی اسے پیار اور محبت سے سمجھا رہی تھیں۔ اُنہیں بھی ہمیش خان کے جانے کا بہت دُکھ تھا۔ اُنہوں نے کبھی داور خان اور اس میں کوئی فرق روا نہ رکھا تھا۔ انہوں نے حویلی آنے پر مریم کو بھی اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔

"جی اماں بی! آ رہی ہوں"۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی تو اماں بی چپ چاپ باہر نکل گئیں۔

"دیکھو گل زریں! حال اگر حال رہے تو قبرستان بن جاتا ہے۔ اگر دل میں ہلچل نہ ہو تو ایک جیسا سکوت موت کی علامت ہے۔ انقلاب ہی اصل زندگی کا نام ہے۔ اُٹھو۔۔۔۔ سب تمہارے لئے پریشان ہیں"۔ پوردل اسے رسانیت سے سمجھا رہی تھی لیکن وہ شاید کچھ بھی سمجھنے پر تیار نہ تھی۔

"دیکھو گل زریں! اگر تم بچے کی وجہ سے پریشان ہو تو ابھی دو ماہ ہی ہوئے ہیں ہم کسی بھی اچھی ڈاکٹر سے۔۔۔۔۔۔"

"پلیز پوردل چپ کر جاؤ۔ آئندہ ایسی کوئی بات نہ کرنا۔ کیونکہ اگر محبت کا انجام رسوا ہونا لکھا ہے تو مجھے یہ رسوائی منظور ہے۔ پتہ ہے پوردل میں نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت میں آہ و فغاں اور درد کا وجود لازم ہے کیونکہ محبت آہوں، فریادوں اور درد کا نام ہے۔ اسلئے ہمیش خان کے نام پر مجھے

تمام درد قبول ہیں"۔ وہ اسکی حالت پر کٹ کر رہ گئی وہ ساری حقیقت جانتی تھی کیونکہ گل زریں نے نیم بیہوشی میں جب ساری بات اگلی تھی اس وقت اسکے پاس صرف وہی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ہمیش خان سے کتنی محبت کرتی ہے۔

بہار میں جو پھول مسکراتا ہے وہ جلد مرجھا جاتا ہے۔ جو لالہ صحرا میں کھلتا ہے وہ اسکی پتیوں کی للک کج رفتار کو منتشر کر دیتا ہے۔ آسمان کے تھپیڑے خشک مٹی کو اُٹھا کر کہیں سے کہیں لا پھینکتے ہیں۔ اسی کو تقدیر کا نام دیا جاتا ہے کہ تقدیر چاہے تو محبتوں کو نئے رنگ بخش دیتی ہے اور چاہے تو پرانے رنگ بھی نوچ ڈالے۔

"اے خدایا! یہ کس صحرا سے میرا گزر ہو رہا ہے؟ آنکھوں سے نیند اُڑ گئی ہے۔ پاؤں پر آبلے ہے، راہ میں کانٹے ہیں، چاروں طرف گھٹا گھپ اندھیرے اور طوفان ہے۔ میں جاؤں تو جاؤں کہاں؟"۔ وہ اپنی حالت پر خود ہی سسک رہی تھی۔ آج وہ اس اُجاڑ اور ویران مکان کی طرح ہو گئی تھی جہاں کوئی آنا پسند نہیں کرتا جیسے کوئی مُردہ قبرستان میں ہو۔ وہ وقت کی چکی میں اسطرح پس گئی تھی جیسے جسطرح پھول مٹی کیساتھ دھول بن کر چمن میں بکھر جاتا ہے۔ احساس کی آنکھیں اس نے خود ہی اندھی کر لی تھیں آہ اب کیا ہو سکتا تھا۔

پھر سردیوں کی ٹھٹھرتی رات کو اس نے ایک بچی کو جنم دیا۔ آغا جی اور داور خان نے اس بچی کو ہمیش کا نام دیا تو گل زریں نے ہمیش اور مریم کی محبت کے پیشِ نظر مریم یعنی پاکیزہ رکھ دیا۔ دن ہفتے اور ہفتے مہینوں میں بدلتے چلے گئے۔ وہ جو گیا تو ایسا گیا کہ واپس نہ لوٹا۔ آج اٹھ سال گزرنے کے بعد داور خان کی ذرا سی بات اسے اس کے ماضی میں لے گئی۔ اس ماضی میں جسکا ایک ایک پرت اس نے اپنی بیٹی سے چھپا رکھا تھا۔ مریم خان سارا سارا دن ہمیش خان کی تصویر ساتھ لئے پھرتی۔ ماں کی نم آنکھیں دیکھ کر اسکا ننھا دماغ صرف اتنا سوچتا کہ اُنہیں بابا یاد آرہے ہیں۔

وہ جیسے ہی مریم کو سکول سے لیکر لوٹی اسکے پاؤں گویا زمین نے جکڑ لئے۔ وہ سامنے ہی آغا جی کے قدموں میں بیٹھا تھا اور ساتھ ہی اماں بی، داور لالہ، ننھا شیر خان۔ اس نے ایک نظر سب پر غصے بھری ڈالی اور مریم کو وہیں چھوڑ کر سرپٹ اوپر اپنے کمرے کی جانب بھاگی۔ آنسو جانے کب سے رکے تھے۔ ایک دم سے ہی گریبان پر لہو کی بارش کرنے لگے۔

"آؤ نا مریم"۔ مریم کا نام سن کر وہ چونکا اور جھکا ہوا سر اُٹھایا تو آنکھوں میں ڈھیروں حیرانی سمیٹے اس ننھی بچی کی جانب دیکھنے لگا جو بمشکل ساڑھے سات سال کی ہوگی۔

"مریم! بھلا پہچانو تو یہ کون ہیں؟" پوردل اسے انگلی سے پکڑ کر ہمیش خان کے سامنے لے آئی۔

"یہ۔۔۔۔" وہ مسکرائی، "یہ میرے بابا ہیں۔ ہیں نہ نانو"۔ وہ آغاجی کی طرف دیکھ کر بولی تو ہمیش خان ٹھٹکا۔

"بابا! کیا مطلب۔۔۔۔۔" اس نے سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔

"یہ گل زریں کی بیٹی ہے مریم۔ ہم نے تم سے پوچھے بنا اسکی ولدیت میں تمہارا نام لکھوادیا کیونکہ بہرحال لوگوں کیلئے تم ہی گل زریں کے شوہر تھے"۔ داور خان نظریں جھکا کر بولے کہ نہ جانے ہمیش خان کیا جواب دے لیکن اسکا جواب سن کر وہ چونکے بنا نہ رہ سکے۔

"یہ میری ہی بیٹی ہے داور لالہ! میں ہی اس بدنصیب مریم کا باپ ہوں"۔ وہ ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ مریم کو پکڑ کر گلے سے لگا کر بھینچ ڈالا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ پھر اس نے شروع سے لیکر آخر تک سب کہہ سنایا۔ سب کی حالت بہت بری تھی۔ آغاجی شاکڈ تھے تو داور لالہ مزید ندامت سے سر کو جھکا گئے کہ وہ خود ان سے آنکھیں ہی نہ ملا پا رہا تھا۔

"آپ میرے بابا ہیں نہ؟"، مریم معصوم سا چہرہ لئے اپنے ننھے منے ہاتھوں کے پیالے میں اسکا چہرہ سمو کر بولی۔

"ہاں میری جان! میں ہی آپکا بابا ہوں"۔ وہ برہ طرح سسک پڑا اور اسے ایک دفعہ پھر سینے سے لگا لیا کیونکہ وہ حقیقت جانتا تھا، دکھ جانتا تھا لیکن بے بس تھا۔

"بابا! میری گڑیا کدھر ہے اور شیر خان کی سائیکل؟"۔ اس نے سوالیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔

"گڑیا اور سائیکل۔۔۔"

"ماما کہتی تھیں جب بابا آئیں گے تو ڈھیر ساری چیزیں لائیں گے وہ"۔ اسکول یونیفارم میں کوئی ننھا سا فرشتہ لگ رہی تھی۔

"میں اپنے بیٹے کو ساتھ لیکر جاؤں گا اور اسکی پسند کی گڑیا اسے دلواؤں گا"۔ وہ اسکی محبت پر سرشار ہی تو ہو گیا تھا۔

"اور شیر خان کی سائیکل بھی"۔ وہ تنبیہ کرتے ہوئے بولی تو وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکا اور مریم سیڑھیوں کی طرف بھاگ گئی۔

"بہت برا کیا بچے، بہت برا۔ وہ شروع سے ہی ضدی تھی۔ اتنا بڑا الزام تو اس نے اپنے سر لے لیا۔ کبھی ایک لفظ نہ کہا۔ یہی ظاہر کرتی رہی جیسے۔۔۔۔۔۔۔"۔ اماں بی چپ ہو گئیں تمام آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

"میں بہت شرمندہ ہوں اماں بی۔ میری وجہ سے اتنا کچھ ہو گیا۔ وہ سب کی نظروں سے گر گئی لیکن میں کیا کرتا؟ مجھے اس وقت مریم کے علاوہ کچھ دِکھائی ہی نہ دے رہا تھا نہ اسکے آنسو نہ اسکی حالت، مجھے صرف اس بات کا غصہ تھا کہ اس نے مجھے سمجھا ہی نہیں، میں اسے مریم کا قاتل سمجھتا رہا"۔ اس نے بی اماں کی گود میں سر رکھ دیا اور آنسو تواتر سے بہنے لگے۔ انہوں نے اسے جنم نہیں دیا تھا لیکن سینے سے لگا کر راتوں کو تھپکیاں دیں تھیں۔ اسکی تکلیف پر راتیں جاگ کر گزاری تھیں۔ اس پر اپنی ممتا نچھاور کی تھی۔ اسکی حالت دیکھ کر انکا دل ڈوب رہا تھا۔

"بس ہمیش بچے! یہی قسمت میں لکھا تھا۔ اگر اس نے مریم کیساتھ کچھ کیا تو حقیقت قطعی سے لاعلم ہو کر۔ اس نے زندگی کے آٹھ سال کسطرح گزارے ہیں اسکے گواہ ہم سب ہیں۔ کتنی بار مرنے کی کوشش کی لیکن خدا کو اسکی اور مریم کی زندگی منظور تھی۔ جا بیٹا اس سے معافی مانگ لے۔ سب کچھ بھلا کر قدم بڑھا شاید وہ تیری راہ دیکھ رہی ہو۔ محبت کرنے کی اتنی بڑی سزا نہیں دیتے بچے"۔ وہ ماں تھیں اِسی محبت، اپنائیت اور رسان سے سمجھا رہی تھیں۔ اس نے انکی گود سے سر اُٹھایا اور آگے بڑھ کر آغا جی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"پلیز آغا جی مجھے معاف کر دیں"۔

"کیسی معافی بیٹا۔۔۔ معافی مانگنا ہے تو گل زریں سے مانگو جس نے آٹھ سال کانٹوں پر گزارے ہیں جو حقیقت بتانے پر بے بس تھی۔ جاؤ بیٹا گل زریں کے پاس، جب تمام معاملہ واضح ہو گیا ہے تو منہ چھپانے سے کیا فائدہ۔۔۔۔ ہمت کرو"۔ آغا جی اسکے جڑے ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے بولے تو وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ گویا اسے ایک راستہ مل گیا ہو۔

دِن ڈھلتا چلا گیا اور رات نے آہستہ آہستہ اپنے سیاہ پر پھیلا دیئے جب وہ ندامتوں سے جھکا سر لئے گل زریں کے کمرے میں گیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے آجاؤ"۔ اسکا خیال تھا پوردل ہو گی لیکن ہمیش خان کو دیکھ کر وہ جو بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی تھی فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"آپ۔۔۔ آپ کیوں آئے ہیں یہاں؟" وہ خفیف سی ہو کر بولی۔

"میں کیوں نہیں آسکتا ہوں یہاں۔۔۔ گھر ہے یہ میرا، بیوی ہو تم میری اور۔۔۔۔ اور ایک بیٹی کا باپ ہوں"۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بیٹی۔۔۔ بیٹی کا وجود تو آپکو اس گھر سے نکالنے کا سبب بنا تھا ہمیش خان، کیسی بیٹی اور کس کی بیٹی۔۔۔۔ وہ صرف گل زرین آفریدی کی بیٹی ہے"۔ اسکی آنکھوں میں سرخی اور لب ولہجے میں تلخی اتر آئی تھی۔ وہ دکھ کے مارے اسے دیکھنے لگی۔

"میں سب سے معافی مانگ چکا ہوں گل زرین! سب نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ حقیقت کیا ہے سب کو بتا چکا ہوں کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟" وہ بیڈ کی پائنتی پر بیٹھتے ہوئے بولا وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

"سب نے آپکو معاف کر دیا۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔ میرے گزشتہ ماہ و سال کا حساب کون دے گا ہمیش خان کہ میں نے وہ دن کس کرب میں گزارے۔۔۔۔ میری ماں بھی۔۔ میری ماں ندامت سے جھکا سر لیکر اس دنیا سے چلی گئی۔۔۔۔ جب مجھے تسلی کے دو لفظوں کی ضرورت تھی تب آپ۔۔۔۔ ہمیش خان یہ کہہ کر چلے گئے کہ میں نے خواہشوں کی دنیا بسالی ہے اور آج جب میں اپنے ریزہ ریزہ ہوتے وجود کو بمشکل سمت پائی ہوں تو آپ مجھے پھر ریزہ ریزہ کرنے آپہنچے ہیں۔۔۔۔ ایک کمزور لمحے میں آپ نے مجھ سے میرا نسوانی غرور چھین لیا اور مجھے تڑپنے کیلئے چھوڑ دیا"۔ نم آنکھوں اور تھکے وجود کیساتھ وہ اُسے پشیمانیوں اور ندامتوں میں گھیر گئی لیکن وہ ہمت نہ ہارا۔

"میری طرف دیکھو گل زرین! کیا تمہیں میری محبت پر شک ہے؟ میں نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا ہے گل زرین۔۔۔۔ شاید اس محبت کا ادراک مجھے کبھی حاصل نہ ہوتا اگر میں تم سے اتنی دور نہ جاتا تو۔۔۔۔ آٹھ سال۔۔۔۔۔ آٹھ سال کس ذہنی کرب میں گزارے ہے میں نے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں کب سے خود میں ہمت جمع کر رہا تھا لیکن تمہارا سامنا کرنے سے ڈرتا تھا۔ اگر آج داور لالہ مجھے نہ لاتے تو شاید میں کبھی نہ آتا"۔

وہ نظریں جھکائے رو رہا تھا۔ دل کا سارا درد آنسوؤں کیساتھ بہہ رہا تھا۔ اسے یوں ٹوٹے دیکھ کر اسکے دل کو کچھ ہوا لیکن وہ جلدی کمزور پڑنا نہ چاہتی تھی۔

"آپ نے اگر آٹھ سال ذہنی کرب میں گزارے ہیں تو وہ آپکی کسی لغزش کی سزا تھی ہمیش خان کیونکہ میں نے آپکو اسی دن معاف کر چکی تھی جب مریم نے میری کوکھ سے جنم لیا تھا"۔ وہ کسی ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح بولی۔

"ایسے نہیں گل زریں! اگر وقت کے چراغ روشن ہو گئے ہیں تو ان سے اپنے حصے کی روشنی حاصل کرنا ہوگی۔ تم اگر اسطرح مجھے معاف کرو گی تو میں واپس چلا جاؤں گا گل۔۔۔۔۔۔" وہ اسکی بات سن کر تڑپ اٹھی۔ نگاہ اوپر اٹھائی، جہاں نگاہ سے نگاہ ملی محبت نے اپنا جادو چلا دیا۔ ایک آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر باہر نکلا اور اسکے ڈوپٹے میں جذب ہو گیا۔

"میں خالی ہاتھ اور خالی دامن لوٹا ہوں گل زریں! پلیز مجھے خود سے، اپنی بیٹی سے اور ان پیارے رشتوں سے محروم نہ کرو"۔ اس نے اسے تڑپ کر دیکھا تو ہمیش خان نے اسکے سامنے بے اختیار اپنے ہاتھ باندھ دیئے۔ گل زریں نے تڑپ کر اسکے بندھے ہاتھ پکڑ لئے۔

"ایسا نہ کہیں ہمیش! اب ہم آپکو کہیں نہیں جانے دیں گے"۔ اس نے دل کو سمجھا لیا تھا۔ اپنی بیٹی کی خاطر وہ سمجھوتا کرنے پر راضی ہو گئی تھی۔

"پتہ ہے گل زریں! ایک بار تم نے شائستہ شنواری سے کہا تھا کہ کاش تم محبت میں اتنی با اختیار ہوتی کہ میں تمہارے دل اور تم میری آنکھوں میں ہوتی اور آج گل زریں آج واقعی ہی میں تمہارے دل اور تم میری آنکھوں میں ہو، میرا عشق بھی کامل ہے اور تمہارا حسن بھی کامل ہے۔ یہ سچ ہے گل زریں تم میری محبت تھی تب سے جب ہمارا نکاح ہوا تھا لیکن اظہار کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا جو بھی ہوا اس میں نہ تو تمہارا قصور تھا نہ ہی میرا لیکن سزا ہم دونوں کو ملی"۔ اسکے محبت سے لبریز لہجے میں اس اقرارِ محبت پر گل زریں کی آنکھیں بہنے لگیں۔

"آئی ایم سوری۔۔۔۔۔ رئیلی سوری ہمیش خان! میں نے جان بوجھ کر تمہیں کبھی بھی تکلیف دینا نہیں چاہی۔ مریم کے معاملے میں صرف یہی کہوں گی جو بھی کیا وہ میری محبت کی اِنتہا تھی"۔ وہ ایک تسلسل سے رونے لگی تو ہمیش خان نے اسکے آنسو اپنی اُنگلیوں سے چن لئے۔

"ہم پچھلی باتوں کو بھلا کر نئی زندگی شروع کریں گے اس وعدے کیساتھ کہ کسی غلط فہمی کو دِل میں آنے نہیں دیں گے"۔ ابھی وہ اور کچھ کہتا لیکن پوردل کی آواز سن کر کہتے کہتے رُک گیا۔

"ہمیش لالہ میں نے آپکا کمرہ صاف کروا دیا ہے"۔ پوردل کی آواز سن کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آیا تو سوئی ہوئی مریم کو اس نے کندھوں پر اُٹھا رکھا تھا۔

"ارے یہ کہاں سو گئی؟"۔ وہ اسے اُٹھانے کو آگے بڑھی۔

"یہ میرے کمرے میں سو گئی تھی۔ ویسے میں نے پوردل سے کہہ دیا ہے کہ میرا کمرہ بند کردے"۔ اسکی بات سن کر مریم کو اُٹھاتی گل زریں چونکی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کے جناب آٹھ سال ہو گئے تنہا رہتے ہوئے، تنہا کھاتے ہوئے، تنہا سوتے ہوئے۔۔۔۔۔۔"۔ آخری الفاظ اس نے گل زریں کو دیکھ کر کہے تو وہ جھینپ گئی۔ "بھئی اِتنی خوبصورت بیوی کے ہوتے ہوئے کون کافر تنہا رات بسر کرے"۔ وہ بیڈ پر لیٹتے ہوئے بولا تو مریم کسمسائی اور گل زریں مریم کو لیکر باہر کی طرف لپکی۔

"اب تم کہاں جا رہی ہو؟" وہ اسے ڈوپٹے سے کھینچتے ہوئے بولا۔

"میں۔۔۔ وہ میں۔۔۔۔ ذرا مریم کو اماں بی کے پاس چھوڑ آؤں"۔

اسکی پر حدت نگاہوں کی تپش سے گل زریں کے چہرے پر دُنیا کے رنگ بکھر گئے تھے اور اس نے وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی تھی اور اسکی یہ کیفیت دیکھ کر ہمیش خان کے اندر ایک انہونی سے کیفیت سرایت کر گئی۔

"ذرا جلدی آنا"۔ اسے آواز لگاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ وفا کے معنی میں جو رنگینی ہے محبت میں اتنا ہی جوش ہے اور محبت کا جوش کائناتِ دل کی دولت کی ایک جھلک ہے اور یہی محبت کی کامرانی ہے۔

دوسری طرف مریم کو گل زریں، بی اماں کے کمرے کی طرف لیجاتے ہوئے صرف اِتنا سوچ رہی تھی کہ جب صحرا میں ابر برسنے کو تیار ہو جائے تو صحرا کی خشک مٹی کو قرار آجاتا ہے۔ ہجر کے لمحوں میں صحرا بارش کے وصال کی تمنا کرتا ہے اور جب اسے وصال سے نواز دیا جاتا ہے تو پھر دھوپ کی تمازت خود بخود زائل ہو جاتی ہے۔ اسکی جگہ گھناؤنا سایہ اسے یوں آغوز میں لے لیتا ہے جیسے برسوں کا ساتھ ہو اور مسافت حادثوں کی دھول بن کر دیارِ دل سے دور جا بستی ہے۔